میں خود بھی سوچتا ہوں یہ کیا میرا حال ہے
جس کا جواب چاہئے وہ کیا سوال ہے

لاوا

شعری مجموعہ

جاوید اختر

STAR PUBLICATIONS PVT. LTD.

NEW DELHI 110 002

اُن تصویروں، گیتوں اور یادوں کے نام

جنھیں میرا دوست

فرحان مجیب

اپنے پیچھے چھوڑ گیا ہے

Akhtar, Javed

Lava

(Poems)

New Delhi, Star 2011,

Price Rs. 250/-

© Javed Akhtar

ISBN 97881 7650 5079

ناشر : سٹار پبلیکیشنز (پرائیویٹ لمیٹید)

4/5 آصف علی روڈ، نئی دہلی 110002

پہلا ایڈیشن : 2011

قیمت : دوسو پچاس روپئے Rs. 250/-

مطبع : سٹار پرنٹ و بائنڈ۔ F31 اوکھلا I ۔ نئی دہلی 110020

دو اِک باتیں

لاوا میری غزلوں اور نظموں کا دوسرا مجموعہ ہے۔ پہلا مجموعہ، ترکش، 1995 میں شائع ہوا تھا لہٰذا ، دیر آید درست آید کا پچاس فیصدی یعنی ، دیر آید، تو یقیناً درست ہے، رہا، درست آید، تو اِس کا فیصلہ تو اب آپ کو کرنا ہے۔ میں تو صرف اِس دیر کے لیے کچھ صفائی پیش کر سکتا ہوں۔

اگر میری کاہلی اور تساہلی کو نظر انداز کر دیا جائے تو اِس تاخیر کی اک وجہ یہ بتائی جا سکتی ہے کہ میرے نزدیک یکے بعد دیگرے مجموعوں کا انبار لگا دینا اپنے اندر کوئی کارنامہ نہیں ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اگر انبار لگے تو مضامینِ نَو کا۔ جس خیال کو اظہار مل چکا ہے اُسے اگر کسی باعث کہنے کی ضرورت محسوس بھی ہو رہی ہو تو کم از کم اندازِ بیان میں ہی کوئی ندرت کوئی جدّت ہو، ورنہ قاری اور سامع کو بلا وجہ زحمت کیوں دی جائے۔ لیکن اگر یہ جدّت برائے جدّت ہے تو کوئی لاکھ سمجھے کہ اُس کی شاعری میں سُرخاب کے پر لگ گئے ہیں مگر اِن پروں میں طاقتِ پرواز نہیں ہو سکتی کہ بات دل سے نہیں نکلی ہے۔ بات تو جب ہے کہ پاسبانِ عقل بھی موجود ہو اور دل بھی محسوس کرے کہ اُسے تنہا چھوڑ دیا گیا ہے۔ میں جانتا ہوں کہ اِس میں تضاد ہے

مگر بے خودی و ہشیاری، سادگی و پُرکاری، یہ سب ایک ساتھ درکار ہیں۔

دراصل شاعری ذہن و دل کا امتزاج، فکر و جذبات کی ہم آہنگی مانگتی ہے۔ میں نے صدقِ دل سے یہی کوشش کی ہے کہ میں شاعری کی یہ فرمائش پوری کرسکوں۔ شاید اِسی لیے دیر لگ گئی۔ پھر بھی کون جانے کہ یہ فرمائش کس حد تک پوری ہوسکی ہے۔

جہاں مَیں تہہِ دل سے ممنون ہوں اپنے کرم فرما محترم گوپی چند نارنگ صاحب کا جنھوں نے پچھلے دنوں طبیعت ناساز ہونے کے باوجود اس مجموعے کا پیش لفظ لکھنے کی زحمت گوارا فرمائی وہیں اپنے اُن تمام احباب کا شکر گزار ہوں جن کے تعاون اور جن کی ضد کے بغیر یہ مجموعہ شاید ٹلتا ہی رہتا۔ جو نام خصوصاً ذہن میں آرہے ہیں وہ ہیں عبید اعظم اعظمی، سہیل اختر وارثی، وِنے شُکلا، مونس اِجلال، بابا اعظمی اور اٹل تیواری۔

تو لیجیے، لاوا آپ کے حوالے۔

جاوید اختر

۳۰ر دسمبر ۲۰۱۱

فہرست

جاوید اختر کی شاعری.... - گوپی چند نارنگ 13
زبان (نظم) 31
جدھر جاتے ہیں سب جانا اُدھر اچھا نہیں لگتا 34
کبھی کبھی میں یہ سوچتا ہوں کہ مجھ کو تیری تلاش کیوں ہے 36
یہ کھیل کیا ہے (نظم) 38
کل جہاں دیوار تھی ہے آج اک در دیکھیے 43
ہم نے ڈھونڈے بھی تو ڈھونڈے ہیں سہارے کیسے 45
آنسو (نظم) 47
یقین کا اگر کوئی بھی سلسلا نہیں رہا 51
بظاہر کیا ہے جو حاصل نہیں ہے 53
کائنات (نظم) 55
جینا مشکل ہے کہ آسان ذرا دیکھ تو لو 59
تُو کسی پہ جاں کو نثار کر دے 61
اعتراف (نظم) 63
مثال اِس کی کہاں ہے کوئی زمانے میں 64
یہی حالات ابتدا سے رہے 66

خدا حافظ (نظم) 68
جب آئینہ کوئی دیکھو اک اجنبی دیکھو 74
ساری حیرت ہے مری ساری ادا اُس کی ہے 76
پرستار (نظم) 78
نگل گئے سب کے سب سمندر زمیں بچی اب کہیں نہیں ہے 82
درد اپناتا ہے پرائے کون 84
عجیب قصہ ہے (نظم) 86
شکر ہے خیریت سے ہوں صاحب 90
کھلا ہے در پہ ترا انتظار جاتا رہا 92
دشتِ جنوں ویرانیاں ـــ تنہائیاں تنہائیاں تنہائیاں 94
دل (نظم) 97
آرزو کے مسافر (نظم) 99
برسوں کی رسم و راہ تھی اک روز اُس نے توڑ دی 108
پیاس کی کیسے لائے تاب کوئی 110
برگد (نظم) 112
شبانہ (نظم) 114
دست بردار اگر آپ غضب سے ہو جائیں 117
میں کب سے کتنا ہوں تنہا تجھے پتا بھی نہیں 119
کچی بستی (نظم) 121
ایک شاعر دوست سے (نظم) 125
دل کا ہر درد کھو گیا جیسے 127

ابھی ضمیر میں تھوڑی سی جان باقی ہے 129
یہ مجھ سے پوچھتے ہیں چارہ گر کیوں 131
زندگی کی آندھی میں ذہن کا شجر تنہا 133
وہ زمانا گزر گیا کب کا 135
یہ دنیا تم کو راس آئے تو کہنا 137
بروقت ۔ ایک اور خیال (نظم) 139
عجیب آدمی تھا وہ (نظم) 141
آج میں نے اپنا پھر سودا کیا 145
میلے (نظم) 147
مونتاج (نظم) 151
کس لیے کیجیے بزم آرائی 153
نہ خوشی دے تو کچھ دلاسا دے 155
پندرہ اگست (نظم) 157
میں خود بھی کب سے کہتا ہوں کوئی سبب نہیں 162
ہمسائے کے نام (نظم) 164
ہمارے دل میں اب تلخی نہیں ہے 167
یاد اُسے بھی ایک ادھورا افسانا تو ہوگا 169
درد کچھ دن تو میہماں ٹھہرے 171
پیڑ سے لپٹی بیل (نظم) 173

گوپی چند نارنگ

جاوید اختر کی شاعری

پیڑ سے لپٹی سوچ کی بیل

’ہوگا کوئی ایسا بھی کہ غالبؔ کو نہ جانے، شاعر تو وہ اچھا ہے پہ بدنام بہت ہے‘۔ یہاں غالبؔ نے شخص کو شاعری سے جدا کیا ہے، جبکہ جو شخصیت کا نشیب و فراز ہے یا زندگی کی واردات ہے وہ تو شاعری میں جھانکے گی ہی لیکن شاعری آئینۂ محض بھی نہیں ہے ذات کا۔ مزید یہ کہ غالبؔ نے مقطع میں لفظ ’بدنام‘ کو ایسی جگہ رکھا ہے کہ لفظ ’اچھا‘ کی اچھائی نمایاں ہوگئی ہے‘ اور ’بدنام‘ بطور تعریض آیا ہے بہ مراد نیک نامی و شہرت۔ بلاتشبیہ اتنی بات تو کہی جاسکتی ہے کہ کون نہیں جانتا کہ جاوید اختر کی شہرت ان کی شاعری سے کئی قدم آگے چلتی ہے، حالانکہ ہم کو اُس جاوید اختر سے مطلب نہیں جسے سلولائیڈ کی دنیا والے جانتے ہیں اور نہ جاننے کی طرح جانتے ہیں۔ اس لیے کہ وہ عکس کی دنیا ہے جس کا رنگ و نور بھی سب عکس ہے Simulacra — یعنی اصل کہیں نہیں ہے، فقط ماسٹر ہے جو خود عکس ہے، جو ہے نہیں بنا دیا گیا ہے، گویا یہ نمائش سراب کی سی ہے۔ جبکہ زبان اگرچہ وضعی ہے لیکن شعر اگر خونِ جگر سے لکھا گیا ہے اور باطن کی آگ سے آیا ہے تو نہ صرف اصل بلکہ زندگی کی صداقت و بصیرت کا رازداں ہے جیسے کہ آگے چل کر ہم دیکھیں گے۔

جاوید اختر کی شخصیت کا ایک اور پہلو بھی ہے وہ بھی کم نمایاں نہیں۔ اردو کا شاید ہی

کوئی شاعر ہوگا جو ددھیالی اور ننھیالی رشتوں سے اتنی جیّد اور تاریخ ساز ہستیوں سے جڑا ہوا ہو اور علمی و شعری وراثت کڑی در کڑی اور سینہ در سینہ چلی آتی ہو۔ علامہ فضل حق خیرآبادی کا نام کون نہیں جانتا، بلا کے ذہین اپنے زمانے کے فاضلِ اجل تھے۔ غالبؔ ان کے بہ دل مداح اور معترف تھے۔ کہا جاتا ہے کہ دیوان کے انتخاب میں بھی ان کا مشورہ شامل تھا۔ غدر کے فتویٰ پر انھوں نے دستخط کیے تھے اور انگریزوں کے خلاف ہندوستان کے عوام کو بھڑکانے کے الزام میں کالے پانی کی سزا پائی تھی اور پیشتر اس کے پروانۂ رہائی انڈمان پہنچتا' وہ قیدِ فرنگ اور قیدِ جسم دونوں سے آزاد ہوگئے۔ ان کا مزار آج بھی انڈمان میں سمندر کے نیلے پانیوں کے کنارے ایک اونچے ٹیلے پر پیڑوں سے ڈھکا ہوا مرجعِ خلائق ہے۔ مولانا ان کے جدّ تھے، یعنی اپنے دور کے قادرالکلام شاعر مضطرؔ خیرآبادی کے نانا تھے۔ جاوید اختر، ترقی پسند شاعر جاں نثار اختر اور 'زیرلب' کی صفیہ اختر کے بیٹے اور جواں مرگ شاعر مجازؔ کے بھانجے ہیں۔ خاندان میں شاعر دادیوں اور نانیوں کا تو شمار ہی نہیں۔ کیفیؔ اعظمی سے جو نسبت ہوئی وہ بعد کی چیز ہے، گویا ایں ہمہ خانہ آفتاب است، اور لوح و قلم کی دولت سینہ بہ سینہ چلی آئی ہے۔ البتہ جاں نثار اخترؔ اور مجازؔ نے اسے ایسی فیاضی سے لٹایا اور ٹھکانے لگایا کہ نوجواں جادو بمبئی پہنچا تو اسے فٹ پاتھ کی بے اماں زندگی نصیب ہوئی۔ یوں اس نے حالات و مصائب سے نبرد آزما ہونا اور زمانے کے سرد و گرم کو سمونا شروع ہی سے سیکھ لیا۔ جدوجہدِ حیات واحد کلید ہے جو بند دروازوں کو کھول دیتی ہے۔ اندر کا لاوا جب زبان کا سونا بن کر باہر آیا تو اثر انگیز نظموں میں ڈھلنے لگا۔ پُرکھوں اور بڑوں کا فیضان تو پہنچا لیکن خونِ جگر کی کشید نے کسی کو حاوی نہیں ہونے دیا۔ جاوید اختر کی شاعری ہر جگہ ان کی اپنی شاعری ہے، اس میں ان کی اپنی آواز ہے، اپنا لہجہ اور اپنا پیرایۂ بیان۔

البتہ کبھی کبھی باپ داداؤں سے بڑھ کر نگڑ داداؤں یا پُرکھوں کا لاشعوری رشتہ خون میں حرف زن ہوتا ہے۔ جرأت و پامردی، نبرد آزمائی اور ذات پر اعتماد و حوصلہ ویسے بھی

آرکی ٹائپ ہیں جو لاشعوری رشتوں سے آتے ہیں۔ فقط ایک اشارہ کرتا ہوں بات واضح ہو جائے گی۔

تذکرۂ غوثیہ میں ایک دلچسپ واقعہ مولانا فضل حق خیرآبادی کے ضمن میں روایت ہوا ہے کہ مولانا فضل حق، مولوی فضل امام خیرآبادی کے صاحبزادے اور معقولی علما میں خاص مرتبہ رکھتے تھے۔ عربی میں بھی شعر کہتے تھے۔ قابلیت ایسی کہ چھوٹی عمر میں ہی بڑی شہرت حاصل کر لی تھی۔ ایک روز کا ذکر ہے کہ مولانا نے ایک قصیدہ عربی زبان میں امراء القیس کے قصیدہ پر کہا اور مولانا شاہ عبدالعزیز صاحب کی خدمت میں لائے۔ شاہ صاحب قبلہ نے ایک مقام پر اعتراض کیا۔ اس کے جواب میں انھوں نے بیس شعر متقدمین کے پڑھ دیے۔ جناب مولوی فضلِ امام (والد) نے ٹوکا کہ بس حدِ ادب۔ انھوں نے جواب دیا کہ حضرت یہ کوئی علمِ تفسیر و حدیث تو ہے نہیں' شاعری ہے۔ اس میں بے ادبی کی کیا بات ہے۔ مولانا شاہ عبدالعزیز صاحب جن کے آگے کوئی دم نہیں مار سکتا تھا، سن کر انھوں نے فرمایا ''برخوردار تو سچ کہتا ہے مجھ کو سہو ہوا تھا''۔

جاوید اختر کا مجموعہ 'ترکش' برسوں پہلے منظرِ عام پر آیا تھا۔ قرۃ العین حیدر نے اس پر صاد کیا تھا اس کے بعد کوئی کیا لکھے گا۔ جادو کے بچپن کی نشو و نما اور ایک نحیف و نزار حوصلہ مند خاتون کی ہمت و پامردی کا نہایت دردناک رپورتاژ تھا جس سے باطن میں حزن و ملال کی ایک چادر سی پھیل جاتی ہے۔ جاوید اختر نے غزلیں بھی کہی ہیں اور نظمیں بھی لیکن ان کا جادو نظموں میں چلا، جیسے 'وقت' 'وہ کمرہ یاد آتا ہے' 'ایک مہرے کا سفر' 'مری آوارگی' 'بھوک' 'مدر ٹریزا' گویا ان کا ٹریڈ مارک بن گئیں۔ لیکن یہ نظمیں جدید نظم کی اس روایت سے خاصی مختلف ہیں جو، ن م راشدؔ میراجیؔ مجید امجدؔ اور اخترؔ الایمان سے چلی آتی تھی یا جس میں مجازؔ و جاں نثار اخترؔ و سردار جعفریؔ و کیفیؔ اعظمی سب شریک تھے۔ خود جاوید اختر کی اپنی آواز کیا ہے؟ اپنے مسائل، اپنی سوچ، اپنی شعری تشکیل، اپنے پیکر یا اپنا

پیرایۂ بیان کیا ہے جسے خود جاوید اختر کی شاعری نے وضع کیا ہے، یا جس پر کسی کی چھاپ نہیں ہے۔اس سے آج تک کسی نے بحث نہیں کی، داد البتہ سب نے دی ہے۔

جاوید اختر کی نظموں میں چھوٹی بڑی ہر طرح کی نظمیں ہیں، چھوٹی یہی کوئی دو تین صفحے، بڑی چھ سات صفحے۔ان کی بُنت یا ساخت میں ایک چیز جو بار بار متوجہ کرتی ہے وہ ان کا ذہنی تجسس یا تفکر و تعقل کی کارکردگی ہے، یعنی ان کی سوچ کسی مسئلہ کی کنہ کو پانے کی، کسی لاینحل نکتہ یا گتھی کو کھولنے کی یا کائنات کے اسرار، یا انسان کے باطن یا زندگی کے رازوں کو جاننے کی سعی ہے۔ 'یہ کھیل کیا ہے'، 'کائنات'، 'عجیب قصہ ہے'، 'برگد'، 'بروقت ایک اور خیال' ان سب نظموں میں قدرِ مشترک ان کا ذہنی تجسس ہے، بظاہر نظر نہ آنے والے کسی بھید کو جاننے یا راز کو پانے کی سعی و جستجو۔ دوسرے یہ کہ بالعموم نظموں کی تشکیل میں جاوید اختر چھوٹے چھوٹے مصرعوں سے کام لیتے ہیں۔ ایسا نہیں کہ لمبی بحروں پر وہ قادر نہیں، غزلوں میں متعدد غزلیں طویل زمینوں میں بھی ہیں۔لیکن نظموں میں وہ پارہ پارہ کر کے چلتے ہیں، کڑی در کڑی سوچتے ہوئے موضوع کی شعری تشکیل میں درجہ بدرجہ گہرائی میں جاتے ہوئے نظم کی تعمیر کرتے ہیں۔تیسرے یہ کہ سوال پر سوال اٹھاتے ہیں، چوتھے یہ کہ ان درجہ بدرجہ سوچتے ہوئے سوالوں میں قاری کو ساتھ لیتے ہوئے، مکالمہ کرتے ہوئے، رد یا قبول کرتے ہوئے، مصرع در مصرع، سوال در سوال اٹھاتے ہوئے وہ آگے بڑھتے ہیں، پانچویں یہ کہ ان میں سوچ کی فقط استفہامیہ ہی نہیں کہیں کہیں استعجابیہ فضا بھی ملتی ہے:

میں سوچتا ہوں
یہ مہرے کیا ہیں
اگر میں سمجھوں
کہ یہ جو مہرے ہیں

صرف لکڑی کے ہیں کھلونے
تو جیتنا کیا ہے ہارنا کیا

نظم کا عنوان ہے 'یہ کھیل کیا ہے'۔ جیسے جیسے نظم آگے بڑھتی ہے اندازہ ہوتا ہے کہ بات شطرنج ہی کی نہیں، زندگی کی ہے۔ یہ جیت ہار زندگی کی ہے۔شطرنج تو فقط استعارہ ہے، سیاہ و سفید مہرے دن اور رات ہیں اور یہ ساری سرگرمی و ساری کشاکش جدوجہدِ حیات کی ہے:

تو کھیل کیا ہے
میں سوچتا ہوں
جو کھیلنا ہے
تو اپنے دل میں یقین کر لوں
یہ مہرے سچ مچ کے بادشاہ و وزیر
سچ مچ کے ہیں پیادے
اور اِن کے آگے ہے
دشمنوں کی وہ فوج
رکھتی ہے جو کہ مجھ کو تباہ کرنے کے
سارے منصوبے
سب ارادے

پھر بادشاہ و وزیر تو طاقت اور مقتدرہ کے مظہر ہیں اور پیادے بے بس نادار انسان جن کی اپنی کوئی آواز نہیں ہے۔ یہاں سے جنگ کا استعارہ دوہرا ہو جاتا ہے، یعنی اب یہ جنگ فقط ذاتی دفاع، منفعت یا بقا کی نہیں، بلکہ سماجی ظلم و بے انصافی کے استحصالی شکنجہ کے خلاف آگہی اور جدوجہد کا دروا کرنے اور اس کے تئیں احساس کو

گھرا کرنے کی ہے:

اس میں اِس طرح کا اُصول کیوں ہے
پیادہ جو اپنے گھر سے نکلے
پلٹ کے واپس نہ جانے پائے
میں سوچتا ہوں
اگر یہی ہے اُصول
تو پھر اُصول کیا ہے
اگر یہی ہے یہ کھیل
تو پھر یہ کھیل کیا ہے
میں اِن سوالوں سے جانے کب سے اُلجھ رہا ہوں
مرے مخالف نے چال چل دی ہے
اور اب میری چال کے انتظار میں ہے

اختتام پر پورے مبحث کو جس طرح سمیٹا اور ڈرامائی پیچ دیا ہے یہ بھی ان کی خصوصیتِ خاصّہ ہے جس سے نظم کا لطف بڑھ جاتا ہے۔

'کائنات' ایسی ہی ایک اور گرہ در گرہ تجسس تاب نظم ہے۔ آفاق کی وسعت، اس کا کراں تا کراں پھیلاؤ جس کی انتہا کی بھی کوئی انتہا نہیں، یہ ایک اور لاینحل مسئلہ ہے جس کو روٹین سمجھ کر بالعموم عام انسان بے حس گزر جاتا ہے۔ لیکن حکما و فلاسفہ، صوفیا و اولیا سب اس مسئلہ سے نبرد آزما رہے ہیں۔ آئن سٹائن نے کہا تھا 'خدا پانسہ نہیں پھینکتا' تب سے کوانٹم فزکس رازوں کے راز کھولنے میں لگی ہے لیکن راز کھل گئے ہوں ایسا نہیں ہے۔ زماں کی طرح مکاں بھی ایسا مسئلہ ہے جو سِرّ الاسرار ہے۔ سوئٹزرلینڈ میں CERN اپنا کام کیے جاری ہے، Higgs Boson کی دریافت پر خوشی کی جو لہر اٹھی تھی وہ ہنوز

غیر یقینی ہے۔ عروجِ آدمِ خاکی سے انجم لاکھ سہمیں، ستاروں کی گزرگاہیں ہنوز کہکشاؤں کی دھند میں لپٹی ہوئی ہیں۔ البتہ شاعر کی چشمِ تخیل اور وجدان جہاں پہنچتا ہے صدیوں کے نوری فاصلے بھی اس کو نہیں پاٹ سکتے۔ پہلے اشارہ کیا جا چکا ہے کہ جاوید اختر کی نگہِ تجسس ہر منظر کو ٹٹولتی ہے، سوچتی ہے اور سوال قائم کرتی، قاری کو افہام و تفہیم اور تحیر و استعجاب کے مکالمے میں شریک کرتی ہوئی چلتی ہے:

میں کتنی صدیوں سے تک رہا ہوں
یہ کائنات اور اس کی وسعت
تمام حیرت تمام حیرت
یہ کیا تماشا یہ کیا سماں ہے......
جسے سمجھتے ہیں ہم فلک ہے
یہ رات کا چھلنی چھلنی سا کالا آسماں ہے
کہ جس میں جگنو کی شکل میں
بے شمار سورج پگھل رہے ہیں
شہابِ ثاقب ہیں
یا ہمیشہ کی ٹھنڈی کالی فضاؤں میں
جیسے آگ کے تیر چل رہے ہیں
کروڑہا نوری برسوں کے فاصلوں میں پھیلی
یہ کہکشائیں......

اور آخر میں پھر سوالوں کا سوال:

سوال یہ ہے
وہاں سے آگے کوئی زمیں ہے

کوئی فلک ہے
اگر نہیں ہے
تو یہ ''نہیں''، کتنی دور تک ہے

یہ نہیں کہ شاعر کے پاس ان سوالوں کا کوئی حل ہے یا کائنات کے راز جاننے کا کوئی 'مول منتر' ہے۔ لیکن اول تو قاری کے ذہن میں تجسس کا شرارہ رکھ کر شاعر عام روٹین سے بے تعلقی یا خوش فہمی کا خول توڑتا ہے یا یوں کہا جائے کہ تعقل و تفکر کی سعی و جستجو سے پیچیدہ سوالوں کے تئیں احساس کو جگاتا ہے۔ دوسرا پہلو یہ ہے کہ مذہب کے ٹھیکیدار جس طرح صداقت کی ساری کنجیاں اپنے پاس رکھتے ہیں یا عام انسان کے سوال پوچھنے کی صلاحیت کو بھی سلب کر دینا چاہتے ہیں جو فاشزم کا پہلا سبق ہے، شاعر اس پر بھی چوٹ کرتا ہے۔ مذہب کی مذہبیت برحق جو انسان کی صلاح و فلاح کے لیے ہے، خرابی وہاں پیدا ہوتی ہے جہاں کچھ لوگ مذہب کو ڈبیہ میں بند کر کے سادہ لوح عوام میں اس کا سودا کرتے ہیں۔ 'واعظ' استعارتاً آیا ہے یہ برہمن یا مولوی بھی ہو سکتا ہے، گبر و مجوسی بھی یا پارسی و پادری بھی۔ یوں نظم دوہری معنویت پر ختم ہوتی ہے۔ اس میں شاید ہی کسی کو کلام ہو کہ تفکر و تجسس کے اعتبار سے 'ترکش' کے زمانے کی نظم 'وقت' کی طرح یہ نظمیں بھی گہرے غور و فکر کا تقاضا کرتی ہیں۔

تفکر آلود لہجہ اور سوچ کی یہی دھار چھوٹی نظموں میں بھی ملتی ہے۔ البتہ ان نظموں کے مسائل اور سوال مختلف ہیں۔ مگر تعقل و تجسس، کچھ سوچنے کھوجنے کی لگن، اور قاری کے حواس کا حصہ بنا رہنا یا استفہامیہ مکالمہ میں اس کی شمولیت کا پیرایہ وہی ہے، جس کا اشارہ اوپر کیا گیا۔ مثلاً 'عجیب قصہ ہے' 'برگد' 'خدا حافظ' 'آنسو' 'زبان' ایسی ہی جیتی جاگتی سوچنے پر مجبور کرتی ہوئی نظمیں ہیں۔ 'عجیب قصہ ہے' جتنی انسانی رشتوں پر ہے جتنی اس مسئلہ پر کہ آئیڈیل یا منزل کو پانے کی خلش اس کی تڑپ اور جستجو میں ہے فقط کامیابی میں

نہیں۔ کئی بار کامرانی اور آسودگی اپنا بالعکس بھی بن جاتی ہے، یا ہر انقلاب کامیابی کے بعد اپنے آئینہ کا زنگ کیوں بن جاتا ہے۔ 'آنسو' دردمندی کی داستان کہتا ہے۔ 'برگد' قصباتی ثقافت کی یادیں تازہ کرتا ہے کہ ہر چیز جوں کی توں ہے، موڑ بھی، لوگ بھی، راستے بھی لیکن اپنائیت اور ٹھنڈک کی ایک چھاؤں تھی جو وقت کی تپش میں کھو گئی ہے اور جس کو واپس نہیں لایا جا سکتا۔

'زبان' ایک الگ طرح کی نظم ہے اور زیر نظر مجموعہ کا مطلع سرِ دیوان بھی ہے۔ زماں اور مکاں کی طرح زبان بھی رازوں کا راز ہے۔ ازل اور ابد سے بے خبر، خودکار، خودنگر، خودآگاہ اور خودمختار۔ اپنشد کہتا ہے کہ शब्द:ब्रह्म، یعنی شبد برہمہ ہے۔ جدید مفکر ہائیڈیگر کہتا ہے 'Language is Being'۔ مابعد جدیدی لاکاں جو فرائیڈ کا ناخلف شاگرد اور آنندوردھن کا معترف ہے، بدلیل بتاتا ہے کہ انسانی لاشعور زبان کی ساخت رکھتا ہے اور خود زبان انسانی لاشعور کی طرح ہے۔ دیکھا جائے تو غالبؔ کو ابتدائے جوانی میں کیوں کہنا پڑا تھا:

ہجومِ سادہ لوحی پنبۂ گوشِ حریفاں ہے
وگرنہ خواب کی مضمر ہیں افسانے میں تعبیریں

زبان بھی ذات یا کائنات کی طرح ایک نکتۂ لاینحل ہے۔ جاوید اختر اپنے سہج انداز میں مصرع بہ مصرع اس سوال کو اٹھاتے ہیں اور گرہ در گرہ اس کو کھولتے ہیں:

سوچ رہا ہوں
یہ جو اک آواز الف ہے
سیدھی لکیر میں
یہ آخر کس نے بھر دی تھی
کیوں سب نے یہ مان لیا تھا

سامنے میری میز پہ اک جو پھل رکھا ہے
اس کو سیب ہی کیوں کہتے ہیں
سیب تو اک آواز ہے
اس آواز کا اس پھل سے جو انوکھا رشتہ بنا ہے
کیسے بنا تھا

بیسویں صدی میں سوسئیری انقلاب کے بعد لفظ و معنی میں جو جوڑ تھا اس کا ٹانکا کھل گیا ہے۔ دیکھا جائے تو قدامہ ابن جعفر اور ابن قتیبہ سے ابن خلدون تک اور ہندی روایت میں ناگارجن اور بھرتری ہری سے شنکر آچاریہ تک شبد کو شبد اور اکھشر (अक्षर) کو اکھشر (अक्षर) ہی کیوں کہا گیا۔ شاعر بغیر فقہی مباحث میں پڑے زبان کے بھید اور تحیر و استعجاب کی اس لامختتم کائنات کو کھولتا، سوالوں کے سوال پر نظم کو کلائمکس پر لے آتا ہے:

ساری چیزیں
سارے جذبے
سارے خیال
اور اُن کا تعارف
ان کی خبر اور
ان کے ہر پیغام کو دینے پر فائز
ساری آوازیں
ان آوازوں کو اپنے گھر میں ٹھہراتی
اپنی امان میں رکھتی
ٹیڑھی میڑھی لکیریں
کس نے یہ کنبہ جوڑا ہے

یہاں تک پہنچتے پہنچتے نظم مسئلہ کی گہرائی میں اتر جاتی ہے اور مسئلہ کو مزید غور و فکر کے لیے کھول دیتی ہے۔ اکھشر کا مطلب ہے حصر، قائم، جو اپنی جگہ سے ہلایا نہ جا سکے، اٹل۔ جبکہ معنی سیّال ہے جتنا حاضر ہے اتنا غائب بھی۔ رازوں کا راز یہ بھی ہے کہ تبھی تو متن معنی پروری کرتا ہے اور قرأت کے تفاعل سے تناظر کے ساتھ ساتھ تعبیریں بھی بدل جاتی ہیں۔ حق بات یہ ہے کہ اس نظم سے لطف اندوز ہونے کے لیے اس کو بار بار پڑھنا شرط ہے۔ مراۃ الخیال سے بیدلؔ کا ایک دلچسپ واقعہ نقل کیا جاتا ہے جس سے اس نظم کی تعبیر کی ایک اور جہت وا ہو گی جس کو صاحبانِ ذوق خود پا لیں گے۔ بیدلؔ کا مشہور مطلع ہے:

نشد آئینۂ کیفیتِ ما ظاہر آرائی
نہاں ماندیم چوں معنی بچندیں لفظ پیدائی

(آرائشِ ظاہری کے باوجود ہماری اندرونی کیفیت کبھی آشکار نہ ہوئی، اتنے لفظوں کے ہوتے ہوئے بھی ہم معنی کی طرح پنہاں رہے)

شیخ ناصر علی نے اعتراض کیا دوسرا مصرع خلافِ دستور ہے کیونکہ معنی تابع ہے لفظ کے۔ بیدلؔ نے جواب دیا: وہ معنی جسے آپ تابعِ لفظ قرار دیتے ہیں اس کی اصلیت بھی ایک لفظ سے زیادہ نہیں۔ جو چیز حقیقت میں معنی کہلاتی ہے وہ کسی لفظ میں نہیں سما سکتی، مثلاً انسان کی ماہیت ان شرحوں اور تفصیلوں کے باوجود جو کتابوں میں درج ہیں، بالکل نہیں کھل سکی۔ ناصر علی یہ جواب سن کر دم بخود رہ گئے۔

کہنے کی ضرورت نہیں کہ شاعر کا ذہن و تخئیل، چشم زدن میں جہاں پہنچتا ہے فلسفوں کو وہاں تک پہنچنے میں صدیاں طے کرنا پڑتی ہیں۔

ابھی ایسی کئی اور نظمیں ہیں جن کے بارے میں گفتگو کی جا سکتی ہے، بالخصوص 'کچّی بستی'، 'ایک شاعر دوست سے'، 'میلہ' اور 'پیڑ سے لپٹی بیل'۔ شبانہ اور کیفیؔ کے نام نظموں میں بھی خلوص کی آنچ اور سوچ کی لاگ ہے۔ 'گھر میں بیٹھے کیا لکھتے ہو' میں شاعروں کو

تکتا کیا ہے کہ ذرا اپنے خول سے باہر نکل کر بھی دنیا کا نظارہ کرو۔ یہ نظم دراصل ان نقادوں اور بزعم خود دانشوروں کو بھی پڑھنی چاہیے جو رعایتِ لفظی کی سوئیاں چنتے رہتے ہیں یا شعر کے ہجے کرتے ہیں اور نہیں جاننا چاہتے کہ پورا انسانی منظر نامہ بدل چکا ہے۔ 'کچّی بستی' میں جو اپنی وضع کی الگ دنیا ہے محبتوں، چاہتوں، انسانی رشتوں، نیز مافیا، نشہ اور جرائم کی، کیا اسے کسی اور خدا نے بنایا ہے۔ عذاب ثواب سب بے سہاروں کے سر، کرانے والے تو چوباروں میں رہتے ہیں، دستِ غیب تو کہیں اور ہے۔ بستیاں الگ الگ بسا دی ہیں یا انھیں گندی نالیوں میں دھکیل دیا ہے تو کیا خدا سے بھی محروم کر دیا ہے، یا ان کا خدا آنکھیں بند رکھتا ہے۔ 'میلہ' میں بھی فکر کی رَو تہ نشیں ہے اور نکتہ رسی کا حق ادا کیا ہے۔ یہ زندگی بھی ایک میلہ ہے جس میں بچے اور باپ کی خیالی تصویر اور مکالمہ ہے کہ وقت کا دائرہ کس طرح عمروں کی تعبیر کو بدل دیتا ہے اور وہی بچہ جو باپ کے کندھے سے لگ کر سوتا ہے، جب بڑا ہو جاتا ہے تو خود باپ کو بیٹے کے کندھے کی ضرورت ہوتی ہے۔

جاوید اختر کی غزلیں بھی اتنی ہی فکر انگیز اور دل خوش کن ہیں۔ غزل کا ہر شعر واحدہ ہوتا ہے لیکن مجھے تو بعض غزلوں میں بھی رواں دواں کیفیت ملتی ہے۔ ان میں جذبہ و رومان کم اور تعقل و تفکر کی وہی فضا ہے جو نظموں میں ہے۔ غزل کی ایمائیت میں حکیمانہ روایت کا اپنا مقام ہے، لیکن یہاں بھی جاوید اختر کا انداز الگ ہے۔ اکثر ان میں بھی تجسس و تفکر کی مربوط کیفیت ملتی ہے جو اپنا لطف رکھتی ہے۔ مثلاً آج کی صارفیت نے انسانی قدروں اور معاشرتی نقشے کو جیسے درہم برہم کر دیا ہے، اس ضمن میں یہ اشعار ایک اور ہی دردِ دل کہتے نظر آتے ہیں، اور یہ کیفیت آج سے بیس تیس برس پہلے کی نہیں، آج کی زندگی کی ہے:

نگل گئے سب کی سب سمندر زمیں بچی اب کہیں نہیں ہے
بچاتے ہم اپنی جان جس میں وہ کشتی بھی اب کہیں نہیں ہے

بہت دنوں بعد پائی فرصت تو میں نے خود کو پلٹ کے دیکھا
مگر میں پہچانتا تھا جس کو وہ آدمی اب کہیں نہیں ہے
گزر گیا وقت دل پہ لکھ کر نجانے کیسی عجیب باتیں
ورق پلٹتا ہوں میں جو دل کے تو سادگی اب کہیں نہیں ہے
تم اپنے قصبوں میں جا کے دیکھو وہاں بھی اب شہر ہی بسے ہیں
کہ ڈھونڈتے ہو جو زندگی تم وہ زندگی اب کہیں نہیں ہے

یا جب جدوجہد کا باب بند ہو جاتا ہے تو ولولے کیسے سرد پڑ جاتے ہیں اور تحریکیں کیسے خود اپنے ہی خنجر سے خودکشی کرتی ہیں:

وہ زمانہ گزر گیا کب کا
تھا جو دیوانہ مر گیا کب کا
ڈھونڈتا تھا جو اک نئی دنیا
لوٹ کے اپنے گھر گیا کب کا
وہ جو لایا تھا ہم کو دریا تک
پار اکیلے اتر گیا کب کا
خواب در خواب تھا جو شیرازہ
اب کہاں ہے بکھر گیا کب کا

اسی طرح ذیل کے کچھ اشعار اس نوع کے ہیں کہ ان کی فکر آلود معنویت اور لطف و کیفیت کو میں اپنے تک محدود نہیں رکھ سکتا:

احساس کا مسکن ہے ان افکار سے آگے
جنگل یہ عجب آتا ہے بازار سے آگے

کسی کی آنکھ میں مستی تو آج بھی ہے وہی
مگر کبھی جو ہمیں تھا خمار جاتا رہا

آج وہ بھی بچھڑ گیا ہم سے
چلیے یہ قصہ بھی تمام ہوا

کچھ بچھڑنے کے بھی طریقے ہیں
خیر جانے دو جو گیا جیسے

شب کی دہلیز پر شفق ہے لہو
پھر ہوا قتل آفتاب کوئی

کبھی جو تلخ کلامی تھی وہ بھی ختم ہوئی
کبھی گلہ تھا ہمیں اُن سے اب گلا بھی نہیں

میں کب سے کتنا ہوں تنہا تجھے پتا بھی نہیں
ترا تو کوئی خدا ہے مرا خدا بھی نہیں

زندگی کی شراب مانگتے ہو
ہم کو دیکھو کہ پی کے پیاسے رہے

نہ تو دم لیتی ہے تُو اور نہ ہوا تھمتی ہے
زندگی زلف تری کوئی سنوارے کیسے

پُر سکوں لگتی ہے کتنی جھیل کے پانی پہ بط
پیروں کی بے تابیاں پانی کے اندر دیکھیے

آج میں نے اپنا پھر سودا کیا
اور پھر میں دور سے دیکھا کیا

زندگی بھر میرے کام آئے اصول
ایک اک کر کے انھیں بیچا کیا

نہ کوئی عشق ہے باقی نہ کوئی پرچم ہے
لوگ دیوانے بھلا کس کے سبب سے ہو جائیں

ہمارے ذہن کی بستی میں آگ ایسی لگی
کہ جو تھا خاک ہوا اک دکان باقی ہے

ڈھلکی شانوں سے ہر یقیں کی قبا
زندگی لے رہی ہے انگڑائی

جاوید اختر کے آتش کدے کی کچھ چنگاریوں کو ہم نے دیکھا۔ لاوا جب جم جاتا

ہےتواس سے چٹانیں چوٹیاں اوروادیاں ابھرتی ہیں۔ہم نے ان کی ایک جھلک دیکھی، دوسری قرأتوں سے دوسرے مناظر نہ ابھریں ایسا ممکن نہیں۔کوئی ایک قرأت دوسرے امکانات کوختم نہیں کرتی۔اس مجموعہ کی آخری نظم 'پیڑ سے لپٹی بیل' کا شمار میں حسّاس ترین نظموں میں کرتا ہوں۔اس میں فکر وتجسس کی وہی سوال کرتی ہوئی استعاراتی فضا ہے، وہی چھوٹے چھوٹے مصرعے، وہی استعجابیہ اور استفہامیہ فضا ہے جوان کی تخلیقی پہچان ہے۔بیل تو پیڑ کی ایک ڈالی سے لپٹی بے مایہ چیز تھی۔پیڑ کی خوشبواور رنگت اس میں سماتی چلی گئی اور بجائے خود یہ پیڑ کے وجود کا حصہ بن گئی۔'پیڑ کے یوں تو سو افسانے تھے/ پر بیل کا کوئی ذکرنہیں تھا' پھر کیسے آج بیل اپنی بانہوں میں پیڑ کے وجود کوسنبھالے اس کی زندگی کا سہارا بنی ہوئی ہے؟

بیل اپنی بانہوں میں اب ہے پیڑسنبھالے
دھیرے دھیرے
گھائل شاخوں پر
پتے پھر نکل رہے ہیں
دھیرے دھیرے
نئی جڑیں پھوٹی ہیں
اوردھرتی میں گہری اتر رہی ہیں
بیل پہ جیسے
ایک نئی مسکان کے ننھے پھول کھلے ہیں

زندگی کی نامہری اور ناامیدی کوامید سے بدل دینے کا منظرنامہ ہے۔لیکن یہ پیڑ کون ہے اور یہ بیل کون ہے جوآس وامید کا استعارہ اورنموکی نوید ہے، پھرلپٹی ہوئی بھی اسقدر ہے کہ الگ نہیں کی جاسکتی۔مجھے کہنے دیجیے کہ جاویداختر کی شاعری میں جذبات کا

طوفان نظرنہیں آتا۔ یہاں جوش وخروش کی آندھیاں نہیں۔حوصلہ مندی اور امید تو ہے لیکن باگیں کھچی ہوئی ہیں۔ لاوا تو ہے، آگ بھی اور تجسس آلودشرار کا شتن بھی جسے ہم دیکھتے آئے ہیں،لیکن وہ بےقابورومانیت نہیں جس کی ہیجان پسندی نےبعض نامی گرامی شعرا کی شاعری کوجذبات کی دلدل بنادیا تھا۔فولاد کا جوہر جیسے زہراب میں اگایا جاتا ہے، یہاں ایک سنبھلی ہوئی کیفیت ہے،فکر میں ڈوبی ہوئی،سوچتی ہوئی،تجسس آلودسوال کرتی ہوئی، مسائل کوانگیز کرتی ہوئی اور قاری کوغوروفکر پر مجبور کرتی ہوئی۔ یہاں زندگی کے نشیب وفراز، مسائل اور مظاہر کی نوعیت و ماہیت پر غور کرنے اور سوالوں کا جواب تلاش کرنے والا ایک مضطرب ذہن سامنے آتا ہے۔غالبؔ نے کہا تھا:

رشک ہے آسائشِ اربابِ غفلت پر اسد
اضطرابِ دل نصیبِ خاطرِ آگاہ ہے

یہ اضطرابِ دل اور خاطرِ آگاہ، حسّاس انسان کے لیے سب سے بڑی نعمت ہیں۔بچپن کے دکھوں اورمحرومیوں میں تابِ مقاومت پیدا کرنے والے اور اندر کے زخمی انسان کی مدافعت کی یہی ایک صورت تھی کہ زمانے کے وار کو کند کرنے، ہر بات پر سوچ کی دھار رکھنے اور جہدِ حیات کے لیے مہمیز کرنے والے ایک خلّاق ذہن کی نشو ونما ہوتی چلی گئی۔سورج اب نصف النہار سے آگے نکل آیا ہے۔پیڑ آندھیوں اور طوفانوں کوجھیل چکا ہے۔شاخ درشاخ لپٹی ہوئی باطن کی سوچ بیل ہی ہے جو بانہوں میں پیڑ کو سنبھالے ہوئے ہے، یہ ہر مرحلہ اور ہر موڑ پر پیڑ کے ساتھ اُگتی اور پھیلتی رہی ہے۔آج اگراس میں رنگ ونور ہے تو یہ فقط پیڑ ہی کے لیے نہیں سب کے لیے خوش آئند ہے۔

○

لاوا